جہادی تحریکوں کی تشکیل اور پذیرائی میں مسلم دنیا کی سیاسی صورت حال کا کردار: ایک تجزیاتی مطالعہ

The Role of Political Instability within the Muslim World in the Emergence and Expansion of Jihadi Movements: An analytical study

Ahmed
PhD Scholar, Lecturer Islamic, Riphah International University, Islamabad:
ahmed.is@riphah.edu.pk

Izaz Ullah
Senior Lecturer, Riphah International University, Islamabad:
izaz.ullah@riphah.edu.pk

Hamad Ullah
MA Political Sciences, University of Science and Technology, Bannu:
hamaddoha333@gmail.com

Abstract
In the circle of Muslim intellectuals, three major approaches are prominent about the relationship between West and Islam: clash, dialogue and to ignoring. Moreover, the clash is not limited to intellectual or democratic domains; it reaches to the edge of war and arm conflict. Scholars and researcher are constantly working to understand the reasons behind this civilizational armed conflict and trying to suggest solutions for it. In this article, narratives of the global jihadi leaders are analyzed differently. In their arguments, global jihadi leaders consistently refer to the political instability of Muslim world. Western academia is also suggesting that the emergence and expansion of radical movements are the result of political instability and western policies towards the Muslim world. In this paper, a qualitative approach is used with the technique of content analysis.

Keywords: *Civilization, Jihadism, Political, Instability, Political Islam*

تعارف:

نو آبادیاتی نظام اور خصوصاً 1923 میں خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد سے مغربی ممالک اور ان کا فلسفۂ حیات دنیا پر غالب ہے۔ اس سے قبل مسلمانوں کی قوت دنیا پر غالب رہی ہے۔ جس طرح مسلم تاریخ میں دنیا کی قیادت مسلم اقوام میں ایک دوسرے کو منتقل ہوتی رہی ہے یا انہی کے درمیان منقسم رہی ہے، اسی طرح مغرب کے ہاں بھی قیادت انہیں میں سے مختلف اقوام میں منتقل ہوتی رہتی ہے یا پھر منقسم رہتی ہے، دو عظیم جنگوں کی نوعیت بھی مغربی اقوام کے درمیان قیادت کے لیے رسا کشی کی ہے، جس میں کچھ مشرقی اقوام بھی شریک رہی ہیں۔ یاد رہے کہ اشتراکیت اور اس کا نظام بھی فی الاصل مغربی تہذیب کے ضمن میں آتا ہے، جو بیسویں صدی کے اندر ایک بڑی قوت کے طور پر موجود تھا۔[1] تہذیبوں کے تصادم (The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order By Samuel P. Huntington) اور تاریخ کا خاتمہ (The End of History and the Last Man by Francis Fukuyama) اپنی اساس میں اسی بات کی توثیق کرتا ہے۔

اس وقت دنیا کی صورت حال یہ ہے کہ مغربی دنیا اور اس کی تہذیب دنیا کی قیادت کر رہی ہے۔ معیشت اور معاشرت، فلسفہ و نظریہ، نظام اور تنظیم، سیاست و قیادت میں انہیں کی طرف نگاہیں اٹھتی ہیں، انہیں سے رہنمائی ملتی ہے اور دنیا کے معاملات میں انہیں کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ تہذیبوں کے مابین مکالمہ و تصادم کی بحث ہر تہذیب میں زیر بحث آتی ہے، لیکن عصر حاضر میں اسلامی تہذیب اور مغرب کے درمیان مکالمے و تصادم کو اِن مباحث میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ مغربی ممالک کی پالیسیز اور ان کے لائحہ عمل کو دیکھتے ہوئے واضح ہوتا ہے کہ

---

[1]: مغربی تہذیب، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تعلق کو جاننے کے لیے ملاحظہ فرمائیں:
ابو طارق۔ ایم۔ اے، مولانا مودودی کے انٹرویو، (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، جنوری 1976ء)، 266- 262؛
جاوید اکبر انصاری، سرمایہ داری کے نقیب، (لاہور: لیکسی بکس، ستمبر 2019)، 161- 164

پچھلی صدی اور خصوصا موجودہ صدی کی یہ دو دہائیاں مغرب اور اسلام کے درمیان آویزش یا کم از کم مکالمے کا دور ہے، اسی زمانے میں ان مباحث کو خاص حیثیت مل گئی ہے۔[2]

15، فروری 1989 میں افغانستان سے روس کے انخلا کے بعد براہ راست تصادم دو تہذیبوں کے مابین شروع ہوا، یعنی اسلام اور مغرب۔ "تہذیبوں کے تصادم" کے نام سے معروف ہونے والے بیانیے کو اگرچہ بعض مفکرین رد کرتے ہیں لیکن بہر حال اس نظریے کو علمی سند حاصل ہے اور مغرب و اسلام میں اس موضوع کو اسی حیثیت سے بہت آگے بڑھایا گیا ہے۔ دوسرا بیانیہ وہ ہے جو تصادم کی بجائے مکالمے کی بات سامنے لاتا ہے۔

تہذیبوں کا تصادم یا تہذیبی مکالمہ:

تہذیبی مکالمے اور تصادم کے معاملے میں مسلمانوں کے اندر مغرب کے حوالے سے تین رویے پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو مغرب اور مسلمانوں کے درمیان تعلق کو تصادم کے طور پر دیکھتا ہے، دوسرا رویہ وہ ہے جو مکالمہ و باہم استفادہ اور افہام تفہیم کا رویہ اپناتا ہے اور تیسرا رویہ نظر انداز کرنے کا ہے۔[3] تصادم کا رویہ عموماً اس فکر میں پایا جاتا ہے جس کو مغربی محققین تواتر کے ساتھ سیاسی اسلام، وہابیت، بنیاد پرست، شدت پسند، اسلام ازم وغیرہ کے ناموں سے پکارتے ہیں۔ مکالمے اور استفادے کا رویہ اس طبقے میں پایا جاتا ہے، جس کو مغرب میں نیو اسلام ازم، ماڈرن اسلام، یا امریکن اسلام کے ناموں سے پہنچانا جاتا ہے۔ اسی طبقے کو مسلمانوں کی اکثریت میں، اور خصوصاً پہلے گروہ کے لوگ متجددین کے نام سے پکارتے ہیں۔ تیسری قسم ان روایتی علما کی ہے جو بالکل روایتی انداز میں مدارس و مساجد کے اندر رہتے ہوئے اپنی دنیا میں مصروف ہیں۔ یہ طبقہ، جدید مسائل میں براہ راست اور فعال حیثیت سے شامل نہیں ہے، حالانکہ یہ طبقہ بھی جدیدیت یا مغربی تہذیب کا مخالف ہے۔ لیکن صرف جدید تہذیب ہی کا مخالف نہیں ہے بلکہ جو طبقہ تصادم پر یقین رکھتا ہے، یہ اس کے بھی خلاف ہے کیونکہ یہ کسی بھی سطح پر جدیدیت کے ساتھ

---

[2]: مکالمے اور تصادم کے حوالے سے ہونے والے مباحث کے لیے دیکھیے:

Ansari, Zafar Ishaq, John L. Esposito "Muslim and the West: Encounter and Dialogue", (Islamabad: Islamic Research Institute, IIUI; Center for Muslim-Christian Understanding, Georgetown University, Washington, D.C., 2001).

[3]: اس تقسیم کی بنیادوں کو دیکھنے کے لیے ملاحظہ فرمائیں: سید ابو الاعلی مودودی، تنقیحات، (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، 2016)۔

آمنا سامنا کرنے کو غلط جانتا ہے۔ یہ بڑی تقسیم ہے، اس کو باریک اور گہری تقسیم تک لے جائیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ مفکرین بیک وقت ایک سے زائد رمزوں میں آئیں۔

تصادم والے گروہ کے اندر بھی بڑی تقسیم واقع ہوئی ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے حالات کا جائزہ لیا اور مسلح جدوجہد کو تصادم کی ایک صورت کے طور پر مؤثر خیال کرتے ہوئے، جہادی فکر و تنظیم کی طرف چلے گئے، جن میں سے ایک بڑی مثال عبد اللہ عزام اور ایمن الظواہری کی ہو سکتی ہے جو اخوان المسلمون سے باقاعدہ وابستگی کے بعد تصادم کی طرف چلے گئے۔ اسی طرح کچھ لوگ ایسے تھے جو تصادم والے گروہ سے مکالمے اور استفادے والے گروہ کی طرف چلے گئے، جن میں طارق رمضان، طیب اردوگان اور راشد الغنوشی وغیرہ شامل ہیں، جنہوں نے اپنی تحریک کو سیکولر بنیادوں پر از سر نو مرتب کیا۔ مذکورہ تقسیم میں ایک اہم قدر مشترک، ان کے بنیادی مفکرین ہیں۔ سید قطب اور سید ابوالاعلی مودودی کو سیاسی اسلام، اسلام ازم کے بنیادی مفکرین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور ان مفکرین کی فکر کو تصادم و مکالمے پر یقین رکھنے والے دونوں گروہوں میں بیک وقت بنیادی حیثیت حاصل ہے، اور اس کی بنیادی وجہ ان کی فکر میں ہر دو گروہوں کے لیے بنیاد فراہم کرنے والی فکر کا موجود ہونا ہے۔ مولانا مودودی کی فکر میں ایسا استدلال بھی موجود ہے جو تصادم پر منتج ہوتا ہے اور ایسی فکر بھی وجود ہے جس سے مکالمے کے لیے استدلال کرنا آسان ہے۔ اس حوالے سے معتدل رائے علامہ یوسف القرضاوی کی معلوم ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"میں ہمیشہ اس بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ مولانا مودودی کی کسی ایک تحریر کی بنیاد پر ان کے سلسلے میں کوئی بات نہ کہی جائے، ہم اس وقت تک ان پر کوئی حکم نہ لگائیں جب تک ان کی تمام تحریروں کو نہ دیکھ لیں۔ کیونکہ جس بات کو وہ ایک جگہ مطلق انداز میں لکھتے ہیں، اسی بات کو دوسری جگہ کچھ شرطوں کے ساتھ مشروط کر دیتے ہیں۔ جس بات کو وہ ایک جگہ عموم کے ساتھ لکھتے ہیں، اسی بات کو دوسری جگہ خاص کر دیتے ہیں۔ جس بات کو وہ ایک خطاب میں مجمل طور پر کہتے ہیں، اسی بات کو وہ دوسری کتاب یا خطاب یا تحریر میں مفصل انداز میں بیان کرتے ہیں۔"[4]

[4]: یوسف القرضاوی، سید مودودیؒ: مفکر، مجدد، مصلح، ت، ابوالاعلی سید سبحانی (لاہور: منشورات، ستمبر 2016)، 119

ریڈیکل اسلام ازم، وہاب ازم، سیاسی اسلام اور مغربی فکر و تہذیب کے تقابلی تفہیم پر بہت کام ہو چکا ہے، یہ ایک وسیع و عریض میدانِ تحقیق ہے۔ اسی طرح ریڈیکل اسلام، وہاب ازم یا سیاسی اسلام وغیرہ ایسے عنوانات ہیں جن کے ضلعی مضامین وجود میں آچکے ہیں اور ان کے اندر بھی ایک بڑی تقسیم پائی جاتی ہے۔ ہم نے اس مقالے میں اسی میدان کے ایک گوشے کو موضوع تحقیق بنایا ہے۔

جس طرح ہم نے اوپر لکھا ہے کہ مغربی تہذیب اور مسلم دنیا پر ان کی نظریاتی و سیاسی تسلط کے حوالے سے ایک رویہ مسلح جدوجہد کا ہے۔ زیر نظر مقالے میں ہم اسی مسلح جدوجہد کا رویہ رکھنے والی جہادی فکر کے نظام استدلال کا جائزہ لیں گے۔ اور اس استدلال پر جو تنقید سامنے آئی ہے اس کو کسی حد تک زیرِ بحث لاتے ہوئے، اس کا جائزہ لیں گے۔ مغرب کے ساتھ براہ راست مسلح تعامل میں عالمی جہادی تحریکوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہے، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ مغرب اپنی فکر و عمل اور سیاسی و خارجہ امور میں عالمیت رکھتا ہے، اس لیے ان کو براہ راست مخاطب کرنے والے بھی عالمی جہادی تحریکوں سے متعلق جنگجو اور ان کے مفکرین ہی ہو سکتے ہیں۔ علاقائی جہادی تنظیموں کے بنیادی مقاصد علاقائی نوعیت کے ہوتے ہیں، جبکہ عالمی جہاد کے مقاصد کسی ایک علاقے تک محدود نہیں ہیں۔[5] تنظیم و تحریک اور اسی طرح علاقائی اور عالمی کے درمیان فرق ہم موجود مقالے میں ضمناً / تمہیداً کریں گے۔

جہادی تحریکوں میں کسی بھی کارروائی کے لیے سیاسی اور مذہبی استدلال فراہم کرنا ایک اہم مرحلہ ہے۔ اپنے اولین مراحل میں عراق جنگ کے بارے میں جہادی تحریکوں کے اندر یہ تصور موجود تھا کہ یہ جنگ مذہبی اور سیاسی نقطۂ نظر سے درست ہے اور اس کا مذہبی اور سیاسی استدلال مضبوط ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جہادی تحریکیں اپنے فعالیت کے لیے مذہبی اور سیاسی استدلال کو ضروری سمجھتی ہیں۔ عالمی جہادی تحریک میں جہاد کی مذہبی اور سیاسی استدلال کی بحث ہر وقت کسی نہ کسی صورت میں چلتی رہتی ہے۔[6]

جہادی تحریکوں کے طریقہ کار کو جاننے اور ان کی فکر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم عالمی جہادی تحریک کا مذہبی و سیاسی استدلال سمجھنے کی کوشش کریں۔ ذیل میں ہم عالمی جہادی تحریک کے مذہبی اور سیاسی استدلال کو جاننے کی کوشش کریں گے:

---

[5]: Thomas Hegghammer, "Global Jihadism after the Iraq War," Middle East Journal, Vol. 60, No. 1 (winter, 2006), 13

[6]: Thomas Hegghammer, "Global Jihadism after the Iraq War", 24

عالمی جہادی تحریک کا سیاسی استدلال:

عالمی جہادی فکر میں سیاسی استدلال کی کچھ اصولی بنیادیں ہیں جن کو ہم ذیل میں ذکر کریں گے:

عالمی جہادی فکر کی ترویج میں بہت اہم کردار عالمی سیاسی پالیسیوں نے ادا کیا ہے۔ مغربی محققین کے ہاں یہ دلیل بہت عام دی جاتی ہے کہ عالمی جہادی فکر کی نشو نما اور اس کی مقبولیت میں بہت اہم کردار مغربی اقوام کی پالیسیوں نے ادا کیا ہے۔ مسلم دنیا کے وہ دیرینہ سیاسی اور عسکری مسائل، جن کے حل کی ذمہ دار کسی نہ کسی درجے میں مغربی اقوام یا اقوام عالم کو قرار دیا جا سکتا ہے، ایسے دیرینہ مسائل نے جہادی فکر کے لیے غذا کی حیثیت اختیار کی ہے۔ فلسطین، افغانستان، کشمیر، بوسنیا، چیچنیا، عراق اور شام کے مسائل ان میں سر فہرست ہیں۔ عالمی جہادی فکر نے انہی مسائل کو استدلال کے طور پر استعمال کرتے ہوئے مسلم دنیا میں جہادی فکر کو وسعت دی ہے۔[7]

محققین کے مطابق افغانستان پر حملے سے القاعدہ کی تنظیمی صلاحیت تو کمزور ہو گئی لیکن اس کا نظریہ عام ہو گیا۔ اسی طرح عراق جنگ نے بھی القاعدہ کی ترویج اور نشو نما میں اہم کردار ادا کیا ہے۔[8] عراق اور دیگر مسلم ممالک میں جو کارروائیاں ہوتی ہیں ان کی تصاویر دیکھ کر لوگ جہاد کی طرف آئے ہیں۔ یعنی عراق، افغانستان اور دیگر مسلم ممالک میں ہونے والی کارروائیوں کو عالمی جہادی تحریک کبھی استدلال اور کبھی جہاد کی ترویج کے لیے استعمال کرتی ہے۔[9] اسی لیے یہ تاثر عام ہے کہ موجودہ جہاد کی اساس مذہبی سے زیادہ سیاسی نوعیت کی ہے۔ اس کا بنیادی استدلال اور اس کی نشو نما کی اساسی وجوہات میں مسلم ممالک میں امن کی خراب صورت حال اور مغربی اقوام کی پالیسیوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ اس جہاد کی اساس فلسطین، کشمیر اور دیگر مقبوضہ علاقہ جات ہیں، جن کی وجہ سے لوگ جہاد کی طرف راغب ہوئے ہیں۔

مقبوضہ مسلم علاقے، ان کی آزادی اور ان کی آزادی کے لیے مسلح جدوجہد یہ روز اول سے جہادی فکر کا بنیادی موضوع ہے۔ "مقبوضہ علاقوں کا دفاع"، عبد اللہ عزام کی سرپرستی میں اس عنوان سے 1984 کے اندر ایک

---

[7]: Kumar Ramakrishna, "Delegitimizing Global Jihadi Ideology in Southeast Asia," Contemporary Southeast Asia, Vol. 27, no. 3 (December 2005), 360

[8]: Rohan Gunaratna, "Responding to Terrorism as a Kinetic and Ideological Threat," The Brown Journal of World Affairs, Vol. 11, No. 2 (Spring 2005), 246

[9]: Kumar Ramakrishna, "Delegitimizing Global Jihadi Ideology in Southeast Asia", 361

فتوی آیا تھا۔ سعودیہ عرب کے مفتی اعظم اور سلفی فکر میں بہت اہم مقام رکھنے والے علامہ بن باز کو جب یہ فتوی دکھایا گیا تو انہوں نے بھی اس فتوی کی توثیق کی۔ جس سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ بعد ازاں جہادی فکر کو کیسے وسعت ملی اور عالمی جہادی فکر میں مقبوضہ علاقوں کے مسئلے نے کیا کردار ادا کیا۔[10]

مقبوضہ علاقے ایک طرف تو سیاسی مسئلہ ہے لیکن دوسری طرف فقہ اور فتوی کی رو سے اس کی ایک مذہبی حیثیت بن جاتی ہے، اس لیے ان دونوں نوعیتیوں کو بیک وقت نظر میں رکھنا بہت ضروری ہے۔ مغربی فکر میں مدافعانہ جنگ کی اجازت، سیاسی یا انسانی حقوق کے تناظر میں دی گئی ہے۔ کیونکہ مغربی فکر کسی مذہبی، خصوصا اسلامی فکر کی بنیاد پر تو وضع نہیں ہوئی اس لیے ان کے ہاں جو مدافعانہ جنگ روا ہے، اس کی نوعیت سیاسی اور دوسرے لفظوں میں سیکولر ہے۔[11] جب ہم مدافعانہ جنگ، یا مقبوضہ علاقوں کی آزادی کو مغربی فکر کے تناظر سے دیکھیں گے تو اس کی نوعیت سیاسی ہو گی لیکن اسی جنگ کو جب ہم جہادی تحریکوں یا مسلمانوں کے تناظر سے دیکھیں گے تو اس کی نوعیت سیاسی کے ساتھ ساتھ مذہبی بن جاتی ہے۔

مقبوضہ علاقے عالمی جہادی فکر میں اور جہادی تحریکوں کی وسعت میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ افغانستان جنگ کے دوران عبد اللہ عزام کی فکر میں ایسی بنیادیں ملتی ہیں جن سے عالمی جہاد کا دروازہ کھل سکتا تھا۔ عبد اللہ عزام کے مطابق افغانستان سے روس کو نکالنا دراصل فسلطین اور دیگر مقبوضہ خطوں سے دشمن کو نکالنے کی ابتداء ہے۔[12] عزام کی اس فکر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ عالمی جہادی فکر میں اہم کردار ادا کرنے والی ایک چیز، مسلمانوں کے مقبوضہ علاقے ہیں۔ یعنی مقبوضہ علاقوں نے عالمی جہادی تحریک کی ابتداء اور اس کی نشو نما میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اسی طرح ووٹ اور ٹیکس کا مسئلہ بھی اپنی ساخت میں سیاسی ہے۔ ووٹ اور ٹیکس دینے کا مسئلہ اس سے قبل الولاء البراء کے تحت بھی ذکر ہوا ہے، چونکہ ووٹ اور ٹیکس ایک سیاسی معاملہ ہے اس لیے اس کو بھی سیاسی استدلال کے ضمن میں ذکر کرنا غلط نہ ہو گا۔ مغربی فکر میں ووٹ اور ٹیکس ایک سیاسی معاملہ ہے اسی طرح مسلمانوں

[10]: Sebastian Schnelle, "Abdullah Azzam, Ideologue of Jihad: Freedom Fighter of Terrorist?" Journal of Church and State, 629

[11]: Sebastian Schnelle, "Abdullah Azzam, Ideologue of Jihad: Freedom Fighter of Terrorist?", 639;642

[12]: Kumar Ramakrishna, "Delegitimizing Global Jihadi Ideology in Southeast Asia", 355

کے ہاں بھی اس کی نوعیت سیاسی ہے لیکن چونکہ جہادی فکر اپنے استدلال کے لیے مذہبی بنیادیں فراہم کرتا ہے اس لیے انہوں نے ووٹ اور ٹیکس کے معاملے کو الولاء البراء کے ضمن میں ذکر کرتے ہوئے اس کو ایک مذہبی حیثیت دے دی ہے۔ جہادی فکر میں اس معاملے پر مباحث موجود ہیں کہ ووٹ اور ٹیکس دینا اگر جرم ہے تو اس جرم کی نوعیت کیا ہے، کیا اس جرم کی بنا پر ووٹرز اور ٹیکس دینے والوں کو بھی قتل کیا جائے گا، یا ان کے جرم کی نوعیت اتنی شدید نہیں ہے کہ جس کی بنا پر قتل روا ہو جائے۔ بعض جہادی مفکرین کے ہاں ووٹ اور ٹیکس دینے کی وجہ سے عوام کی تکفیر اور ان کا قتل جائز نہیں ہے۔[13]

مغرب اور اس کی پالیسیوں کے خلاف جس رد عمل کا اظہار ہوتا ہے، وہ فی الاصل سیاسی نوعیت رکھتا ہے۔ یہ تاثر مغربی محققین کے ہاں بھی پایا جاتا ہے کہ گلوبل جہاد کی نوعیت مغرب مخالف تحریک کی ہے۔ گلوبل جہاد کے بنیادی استدلالات کو دیکھتے ہوئے یہ آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ اس کا اولین ہدف اور اس کو بنیاد فراہم کرنے والی چیز مغربی پالیسیاں ہیں۔

انڈونیشیا میں کام کرنے والی القاعدہ سے منسلک تحریک نے بعض مسلح کارروائیوں کے بعد آسٹریلیا کو درج ذیل پیغام دیا تھا، جس سے بآسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ القاعدہ کی فکر اور ان کی کارروائیوں میں مغرب اور ان کے اتحادیوں کا کون سا رویہ غلط ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے: "ہم آسٹریلین حکومت سے کہتے ہیں کہ وہ عراقی جنگ میں حصہ نہ لے۔ ہم آسٹریلینز سے کہتے ہیں کہ وہ انڈونیشیا چھوڑ دیں۔ مسلم دنیا کی مکمل آزادی تک جہاد جاری رہے گا۔"[14]

اس بیان سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اپنی کارروائیوں کے لیے ان کا ایک استدلال سیاسی نوعیت رکھتا ہے۔ کم از کم اس بیان میں مذہبی استدلال موجود نہیں ہے۔ اس کی نوعیت ایسی نہیں کہ جس کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکے کہ یہ کارروائی ایک آزاد اور مستقل بالذات دینی سرگرمی کے طور پر سرانجام دی گئی ہے بلکہ اس کے برعکس اس کی نوعیت سیاسی ہے، اس کی بنیادی وجہ عراق جنگ میں آسٹریلیا کی شمولیت ہے اور ایسی تمام سرگرمیوں کے لیے بنائے استدلال مقبوضہ علاقے ہیں۔

---

[13]: Sebastian Schnelle, "Abdullah Azzam, Ideologue of Jihad: Freedom Fighter of Terrorist?", 645

[14]: Kumar Ramakrishna, "Delegitimizing Global Jihadi Ideology in Southeast Asia", 344

ایک عرصے تک انڈونیشیا میں جہادی فکر کی سرپرستی کرنے والے القاعدہ کے ایک رہنماء نے اپنی وفات سے قبل یہ اعلان کیا تھا کہ اصل طریقہ و منہج وہی ہے جو اسامہ بن لادن اور القاعدہ نے اپنایا ہوا ہے۔ اس نے مزید یہ کہا ہے کہ اصل دہشت گرد امریکا اور اسرائیل ہے۔ یہ بیان بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے سیاسی ہے۔ امریکا اور اسرائیل کی پالیسیوں کو دیکھتے ہوئے ان کو اصل دہشت گرد قرار دیا گیا ہے اور اس کے جواب میں القاعدہ کے منہج کو درست قرار دیا گیا ہے۔[15]

دوسری طرف ان جہادی سرگرمیوں کو نظاموں اور تہذیب کی جنگ بھی قرار دیا جاتا ہے۔ عالمی جہادی مفکرین کے ہاں یہ استدلال عام طور پر سامنے آتا ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام اور اسلام کی جنگ ہے، لادینیت نے اسلام اور مسلمانوں کو اپنا ہدف بنایا ہوا ہے، یہ مغربی تہذیب اور اسلام کی جنگ ہے۔ یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ مسلم تحریکیں، خواہ ان کا تعلق مسلح جہاد سے ہو یا نہ ہو، ان کے ہاں مغرب اور اسلام کی تہذیبی کشمکش کا تصور پایا جاتا ہے۔ تہذیبوں کی کشمکش کا بیانیہ مغربی مفکرین اور اسلام کو بطور نظام پیش کرنے والوں میں ایک مشترک قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا نہیں کہ ہر مغربی مفکر یا اسلامی مفکر تہذیبی تصادم کے بیانیے کو مانتا ہے، لیکن ایک بڑی تعداد تہذیبی تصادم کو مانتی ہے۔ یہی تہذیبی تصادم کا تصور عالمی جہادی فکر میں بھی پایا جاتا ہے۔ لادینیت کو مغربی نظام کے طور پر لیا جاتا ہے اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ جہادی مفکرین لادینیت اور مغربی نظام کو اسلام پر حملہ آور تصور کرتے ہیں۔ اسی بات کو اکثر اس طرح بھی بیان کیا جاتا ہے کہ مغربی دنیا کی طرف سے آئی ہوئی جنگ ایک نئی صلیبی جنگ ہے اور یہود و نصاریٰ کی یہ جنگ اسلام کے خلاف ہے۔[16]

مغربی اقوام کے رویوں سے عام مسلمانوں میں تہذیبی تصادم، مغرب اور اسلام کی دشمنی کا تصور عام ہوا ہے۔ شدت پسندانہ سوچ رکھنے والوں کو چھوڑ کر، وہ مسلمان جن کا رویہ سیکولر بتایا جاتا ہے، وہ بھی مغرب کو اسلام کا دشمن قرار دیتے ہیں۔ ایسے مسلمانوں کا خیال ہے کہ دہشت گردی کے واقعات سی آئی اے کراتا ہے اور اسی بہانے سے مسلم ممالک کو برباد کر رہا ہے اور اسلام کو بدنام کیا جاتا ہے۔ اسی استدلال کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ خیال عام ہو

[15]: Kumar Ramakrishna, "Delegitimizing Global Jihadi Ideology in Southeast Asia", 356
[16]: Kumar Ramakrishna, "Delegitimizing Global Jihadi Ideology in Southeast Asia", 357

جاتا ہے کہ اسلام پر مغرب حملہ آور ہوا ہے، دفاع ضروری ہے اور دفاع کی ایک صورت مسلح دفاع بھی ہے لہذا مغرب سے مسلمانوں کی بچاؤ کے لیے مسلح دفاع بھی جائز اور ضروری ہے۔[17]

مغربی اقوام کے رویوں کو حوالہ بناتے ہوئے سمیع اللہ فراز نے بھی اپنی تحقیق میں جگہ جگہ اس بات کا حوالہ دیا ہے کہ مغرب یا امریکا کے ساتھ مسلمانوں کی دشمنی یا ان سے مسلمانوں کی نفرت کی اگر کوئی ایک وجہ ہو سکتی ہے تو مسلمان ممالک کے حوالے سے ان کی پالیسیاں ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے:

"The fact is that the Muslims do not hate West or America. But rather the interventionist policy of the West. The presence of U.S. troops in the Muslim heartland, Saudi Arabia, after the Iraqi invasion of Kuwait, was the supposed reason behind the Sept. 11 attacks. The US invasion of Afghanistan and Iraq are the main reason for the Radicalization of the Muslim societies, which urges them to react in the same way."[18]

بعض مغربی محققین کے مطابق جہاد کا حل جمہوریت ہے تاکہ شدت پسندوں کو آواز ملے اور وہ اپنی بات کر سکیں اور رد عمل میں جہاد سے باز رہیں۔ مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت ہونی چاہیے اور ان کے پر امن ذرائع بند نہیں کرنے چاہئیں تاکہ وہ جہادی اور مسلح جدوجہد سے باز رہیں۔[19] اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو گا کہ مغربی مفکرین کے ہاں مسلم دنیا کی سیاسی صورت حال کو بھی جہادی تحریکوں کی بڑھوتری میں اہم تصور کیا جاتا ہے۔ آمریت، بادشاہت کو بھی جہادی تحریکوں کے لیے غذا تصور کیا جاتا ہے۔ نیز یہ نتیجہ نکالنا بھی بالکل درست ہو گا کہ سیاسی اسلام پر یقین رکھنے والوں اور اسلام کو بطور ریاستی سرپرست دیکھنے کے لیے جن لوگوں کے سامنے سیاسی میدان میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں وہ اس رویے کے خلاف جہادی تحریکوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اور اخوان المسلمون اور دیگر اسلامی سیاسی تحریکوں کے تجربات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔

---

[17]: Kumar Ramakrishna, "Delegitimizing Global Jihadi Ideology in Southeast Asia", 359

[18]: Muhammad Samiullah, "Contemporary Western Approaches towards Radical Islamic Movements: The case of Bernard Lewis and J L Esposito", (Ph. D Thesis: University of Punjab, 2012), 54

[19]: Sidney Jones, "Soeharto's New Order and Its Legacy," (ANU Press. 2010), 39

ذیل میں ہم ایک جہادی مبلغ کی تقریر کا ایک ٹکڑا نقل کریں گے جس سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ جہادی سرگرمیوں کے لیے کس طرح کا سیاسی استدلال فراہم کیا جاتا ہے، لیکن ساتھ ہی یاد رہے کہ یہی سیاسی استدلال مذہبی بنیادیں بھی رکھتا ہے۔ التمیمی مسلمانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں: "تم کو غلام بنایا جارہا ہے۔ تمھارا خون پی رہے ہیں۔ تمھارے آباء کی قربانیوں سے ملنے والے ممالک تم سے چھینے جارہے ہیں۔ اے مسلمانوں تم کو کیا ہو گیا ہے۔"[20]

مسلم دنیا میں اور خصوصاً خلیجی ممالک میں جنگ خلیج کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ گلف جنگ میں امریکا نے سعودیہ کا ساتھ دے کر عراق کے خلاف جو جنگ میں حصہ لیا، امریکا کا خیال تھا کہ اس مسلمان خوش ہوں گے لیکن مسلمانوں کی انا مجروح ہو گئی۔ اور یہ خیال پایا جاتا ہے کہ امریکا نے سعودیہ کا ساتھ اپنی مفادات کے حصول کے لیے دیا تھا۔[21] اسی طرح اسامہ اور امریکا کی دشمنی کا آغاز تب ہوا جب سعودیہ نے امریکا کو جنگی مقامات دے دیئے۔ یہ جنگی مقامات سعودیہ نے خلیجی ممالک کی صورت حال اور اپنی حفاظت کے لیے دیئے تھے، اس پر اسامہ بن لادن اور دیگر بہت سے مفکرین سعودیہ پر نقد کرتے رہے۔ اسامہ کے مطابق امریکا نیا صلیبی ہے اور پرانے سے زیادہ خطرناک ہے اور مسلم حکمران ان کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔[22]

23 اگست 1996 میں اسامہ بن لادن کی طرف سے امریکا اور اس کے اتحادیوں کے خلاف اس وقت اعلان جہاد ہوا جب ان کو سوڈان بدر کر دیا گیا۔ اس اعلان جنگ میں جہاں مذہبی استدلال موجود ہے وہاں سیاسی استدلال بھی پوری قطعیت اور وضاحت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ اسامہ بن لادن نے اس اعلان جہاد میں مغرب کی طرف سے ہونے والے معاشی، سیاسی اور معاشرتی حملوں کا بھی ذکر کیا ہے۔[23] نائن الیون پر بات کرتے ہوئے بھی

[20]: Mark Long, "al-Qai'da, and the Challenge for US Foreign Policy," Middle East Journal, 44
[21]: Mark Long, "al-Qai'da, and the Challenge for US Foreign Policy", 46
[22]: Mark Long, "al-Qai'da, and the Challenge for US Foreign Policy", 47
[23]: Robert Stanley Oden, "A Comparison of the Political Thoughts of Huey P. Newton and Osama Bin Laden," The Black Scholar, Vol. 37, No. 2 (Summer 2007), 58

اسامہ نے جگہ جگہ سیاسی استدلال سے کام لیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ 1200 ملین پر مشتمل اس امت کو روز قتل کیا جاتا ہے، فلسطین، کشمیر، بوسنیا وغیرہ میں ہونے والی خونریزی کے حوالے بھی دیئے ہیں۔[24]

بروس رائڈل کے مطابق القاعدہ کے بنیادیں درج ذیل ہیں: امریکا کو مسلم ممالک سے نکال دینا، اسرائیل کو تباہ کرنا، اور خلافت کے نام سے ایک جہادی ریاست بنانا۔ بروس رائڈل کے تجزیے کے مطابق القاعدہ کے لٹریچر اور ان کی قیادت کے پیغامات سے واضح ہوتا ہے کہ پہلے دو مقاصد ان کے ہاں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں جبکہ خلافت کا قیام ان کی ترجیح نہیں ہے، خلافت کے بجائے چھوٹی چھوٹی مختلف امارتیں قائم کرنا ان کے پیش نظر ہے۔ اپنی اس رائے کے حق میں انہوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ روس کے انخلا کے بعد نہ ملا محمد عمر نے اور نہ ہی اسامہ بن لادن نے اپنے لیے خلیفہ کا لفظ استعمال کیا۔

جہادی تحریکوں کے استدلال کو سب سے زیادہ تقویت، اس فکری اور سیاسی تسلط سے ملتی ہے جو مغربی دنیا مسلم ممالک پر قائم رکھنا چاہتی ہے۔ وہ اس پوری فکری، سیاسی و عسکری تسلط کو یہود و نصاری کا اتحاد اور صلیبی جنگوں کا نام دیتے ہیں۔ حرمین میں مغربی افواج کا وجود، فلسطینوں کے خلاف اسرائیل کی حمایت، افغانستان اور عراق پر امریکی حملہ، مغربی عقوبت خانوں میں مسلمانوں اور اسلام کی تذلیل اور تحقیر، ان سب چیزوں کو عالمی جہاد کے لیے بطور استدلال پیش کیا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اسلام اور مسلمان مغربی اقوام کے حملوں کی زد میں ہیں۔

"یہود و نصاری" کے خلاف اعلان جنگ میں اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری وغیرہ کا بنیادی مؤقف سیاسی ہے۔ اور یہ بات طے شدہ حیثیت رکھتی ہے کہ عالمی جہادی تحریک کی بنیاد یہ اعلان جنگ ہے۔[25] القاعدہ کی فکر کے مطابق ان کا اصل دشمن امریکا ہے۔ ان کی فکر میں صلیبی یہودی اتحاد ہی مسلمانوں کے مسائل کی جڑ ہے، مسلمان جس بھی مصیبت میں گرفتار ہیں اس کی وجہ یہی اتحاد ہے۔[26]

---

[24]: Madawi Al-Rasheed, "The Quest to Understand Global Jihad: The Terrorism Industry and Its Discontents," Middle Eastern Studies, Vol. 45, No.2 (Mar. 2009), 334

[25]: John Kelsay, "Muslim Discourse about Jihad and the Counter-narratives Project", 451

[26]: Thomas Hegghammer, "Global Jihadism after the Iraq War," Middle East Journal, 15; Thomas Heggammer, "Al-Qaida Statements 2003-2004: Available at: (http://rapporter.ffi.no/rapporter/2005/01428.pdf); Thomas Hegghammer, "Global Jihadism after the Iraq War," Middle East Journal, 13

القاعدہ کی قیادت اور اس کے مفکرین کے ہاں ہمیں امریکا اور اتحادیوں کی کارروائیوں کے حوالے سے درج ذیل قسم کا استدلال جگہ جگہ ملتا ہے:

"عراق پر امریکی حملے کے مقاصد صرف عراق تک محدود نہیں ہیں۔ اس حملے سے امریکا پورے عرب اور اسلامی دنیا میں اپنے مقاصد پورے کرنا چاہتا ہے۔ اسرائیل کے لیے راہ ہموار کرتے ہوئے اس حملے کا پہلا مقصد عرب ممالک کی فوجی طاقت کو ختم کر دینا ہے۔ اس کا دوسرا بڑا مقصد اسرائیل کی بالادستی کو یقینی بنوانا ہے۔"[27]

"ہم اس معاملے میں تحفظات اور خدشات کے ساتھ دلچسپی لے رہے ہیں کہ امریکا اسلام کے سابقہ دارالخلافہ یعنی عراق پر قابض ہونے، مسلمانوں کے وسائل کو لوٹنے اور حکومت کو اپنے ایجنٹوں کے حوالے کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔"[28]

"امریکا عراق پر حملہ آور ہوا ہے اور عنقریب یہ ایران، سعودیہ عرب، مصر اور سوڈان پر حملہ آور ہو گا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کفار مسلمانوں کو برداشت نہیں کر سکتے، یہ مسلمانوں کے وسائل پر قابض ہونا چاہتے ہیں اور ان کو برباد کرنا چاہتے ہیں۔"[29]

عراق پر امریکی حملے کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں وہ گریٹر اسرائیل کے قیام کے لیے راہ ہموار کرنا چاہتا ہے۔ جس کے بارڈر عراق، مصر، شام، لبنان، سوڈان اور فلسطین تک پھیلے ہوئے ہیں، یہاں تک کے سرزمینِ حرمین کا بھی ایک بڑا حصہ اس کے نقشے میں شامل ہے۔[30]

"ہمیں امریکا۔۔وغیرہ۔۔کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ مصر، سعودیہ، یمن، اور الجیریا پر حملہ آور ہوں تو ہم تب مقابلہ کریں گے۔ ہمیں ابھی سے مقابلے کا آغاز کرنا چاہیے۔ کیونکہ امریکا اور مغربی ممالک کو ہر مسلم ملک میں

[27]: Thomas Hegghammer, "Global Jihadism after the Iraq War", 18
[28]: Thomas Hegghammer, "Al-Qaida Statements 2003-2004", 30
[29]: Thomas Hegghammer, "Global Jihadism after the Iraq War", Middle East Journal, 18
[30]: Thomas Hegghammer, "Al-Qaida Statements 2003-2004", 17

مفادات دکھائی دیتے ہیں،۔ یہ افغانستان، عراق اور چیچنیا وغیرہ پر حملہ آور ہیں اور یہ تیزی کے ساتھ اسرائیل کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوشش میں ہیں۔"[31]

خلاصۂ بحث:

اگر اس پوری بحث کا خلاصہ کرنا مقصود ہو تو یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ مغربی ممالک کی پالیسیاں اور تہذیبوں کے تصادم کا بیانیہ مسلسل جہادی تحریکوں کو غذا فراہم کر رہا ہے۔ مغرب کی پالیسیوں کی وجہ سے مسلم ممالک کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حالات پر جو اثرات پڑتے ہیں ان کو جہادی تحریکوں کے قائدین بطور استدلال استعمال کرتے ہیں اور نتیجتاً ان تحریکوں کو پذیرائی ملتی ہے۔ مقالے میں مغربی مفکرین اور محققین کے ساتھ ساتھ جہادی تحریکوں کے قائدین کے حوالہ جات درج کر دیے گئے ہیں جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موجودہ دنیا کی جہادی تحریکوں کی تشکیل اور ترویج میں مغربی پالیسیوں اور مسلم ممالک کے حالات کا بھی اہم کردار ہے۔

یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے اور مغربی تحقیقی ادارے اس پر مضبوط حوالہ ہیں کہ مغرب مسلم ممالک میں سیاسی، معاشی اور تہذیبی نوعیت کی دلچسپیاں رکھتا ہے، اور انہی دلچسپیوں کی بنا پر مسلم ممالک پر حملہ آور ہوتا ہے یا ان کو اپنے زیر اثر رکھتا ہے۔ مغرب کے اسی رویے کی بنیاد پر وہ ماحول پیدا ہوتا ہے جس میں جہادی تحریکیں بآسانی جنم لیتی ہیں اور ان کے استدلال میں اثر پیدا ہوتا ہے۔

نتائج وسفارشات:

اس تحقیقی مقالے کا مقصد ان سوال کے جواب تک پہنچنا تھا کہ مسلم ممالک کی سیاسی صورت حال کا جہادی تحریکوں کی تشکیل اور پذیرائی میں کیا کردار ہے۔ مغربی محققین اور جہادی تحریکوں کے قائدین کی آرا اور بیانات کو سامنے رکھتے ہوئے اس نتیجے تک پہنچنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ جہادی تحریکوں اور متشدد رویوں کی تشکیل میں مسلم ممالک کے ان سیاسی احوال کا بڑا کردار ہے جو مغربی ممالک کی پالیسیوں کی وجہ سے بنے ہیں۔ لہذا منطقی طور اس مقالے کے سفارشات درج ذیل ہوں گے:

- متشدد رویوں کو کم کرنے اور ان کا تدارک کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلم دنیا سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر آزاد اور خود مختار ہو۔

[31]: Thomas Hegghammer, "Al-Qaida Statements 2003-2004", 64

- جہادی تحریکوں اور غیر جمہوری رویوں کی روک تھام کے لیے ضروری ہے کہ مسلم ممالک میں جمہوری عمل جاری رہے اور اسلامی تحریکوں کو آزادانہ جمہوری عمل میں شریک رکھا جائے۔
- مغربی دنیا اور اسلامی دنیا کو تشدد اور جارحیت کے ہر طریقے پر ترک کر کے مکالمے اور باہم افہام و تفہیم کے رویوں کو اپنانا چاہیے۔
- اگر مغربی دنیا واقعتاً متشددانہ رویوں کو ختم کرنا چاہتی ہے تو ان سیاسی اور معاشی تسلط کا رویہ ترک کر کے برابری کی بنیاد پر اسلام کو سمجھنا چاہیے اور ان اسلامی دنیا کی اندرونی خود مختاری کا خیال رکھنا چاہیے۔